بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اشارات

(پچھلی اشاعت کے اشارات میں جو بحث نامکمل رہ گئی تھی یہ اسی کا بقیہ ہے)

حلقۂ کراچی و سندھ کی جماعتِ اسلامی کے امیر سے اس موقع پر بڑا گناہِ کبیرہ سرزد ہو گیا کہ ان کے قلم سے ایک بیان اخبارات میں شائع ہوا جس میں اسلامی دستور کے سب سے پہلے علمبردار ملک کے دارالسلطنت میں منعقد ہونے والی ان غیر اسلامی تقاریب پر اظہارِ رائے کیا گیا تھا۔ اس گناہ کبیرہ پر ان تقاریب کے مہتمم صاحب نے جس شان سے اظہارِ عتاب فرمایا ہے اور سزا دے دی ہے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کی ایک جھلک بھی دکھا دیں۔ وہ فرماتے ہیں:۔

——"ہم نے حلقۂ سندھ و کراچی کی جماعت اسلامی کے امیر کے بیان کو گہرے اضطراب کے ساتھ دیکھا جو نیشنل آرٹ گیلری کے لیے ہماری چندہ جمع کرنے کی مساعی[1] سے متعلق ہے۔

—— یہ بیان اندھی مذہب پرستی، جہالت اور تاریخی حقائق کی قطعی اُلٹی تعبیر کا ایک مثالی نمونہ ہے۔

—— اس میں "اسلامی اخلاقیات کے لیے خطرہ" کا نعرہ لگا کر مذہب کو خواہ مخواہ گھسیٹ لایا گیا ہے۔

—— کراچی میں "پیرس کی فضا" بنانے کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ جیسے پیرس برائی اور ناشائستگی کا مرکز ہے —— حالانکہ پیرس آرٹ اور کلچر کے وسیع خزانوں سے مالا مال ہونے کے

[1] کس کمال سے ایک "قومی مقصد" (جو اسلامی پھر بھی نہیں ہے) کو آگے کر دیا گیا ہے۔ یہی حکمت اس طرح کے تمام معاملات میں اختیار کر لی گئی ہے۔ مثلاً مینا بازار لگتا ہے تو اس کے ساتھ کسی اسکول کے قیام کے لیے چندہ کا دم چھلا لگا دیا جاتا ہے "اپوا" کی کلچرل سرگرمیاں ہیں تو ان کا جوڑ تعلیم و صحت کے سلسلے کی کچھ سوشل سروسز سے لگا ہوا ہے، اب اگر آپ کسی غیر اسلامی تقریب کی طرف اعتراض کی انگلی اٹھائیں تو کہا جائے گا کہ واہ صاحب وا، ایسی اہم خدمات کو انجام دینے کے لیے جو لوگ کام کر رہے ہیں، ان کے راستے میں اسلام کے نام پر روڑا اٹکایا جاتا ہے۔

لحاظ سے دنیا کے شہروں میں یہ مشکل ہی اپنا کوئی ثانی رکھتا ہے۔

—— یہ غلط ہے کہ آرٹ مسلم تاریخ میں واجد علی شاہ اور محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں نمودار ہوا۔ جی نہیں! یہ تو مسلمانوں کے دورِ عروج میں اُبھرا ہے۔ ایرانی اور مغل مراکز فن دورِ زوال میں پیدا نہیں ہوئے۔

—— تمام "ترقی پسند" مسلم ممالک، خصوصاً مصر و ترکیہ میں براہِ راست ریاست کی سرپرستی اور مالی اعانت سے فنی سرگرمیوں کو فروغ دیا جا رہا ہے۔

—— تو ہم جو اسلام کو اپنا مذہب نہیں مانتی ہیں، وہ اخلاق و کردار کے جن اصولوں کے بل پر عظمت حاصل کیے ہوئے ہیں، —— کاش کہ ہم نے اتنی مدت تک ان اصولوں سے صرفِ نظر نہ کیا ہوتا۔

—— یہ خصوصیت صرف جہلا کی ہو سکتی ہے کہ وہ دوسروں کے اخلاق و سیرت کی بنیادوں کو سمجھے بوجھے بغیر اُن پر اپنے اخلاقی نظریات کو ٹھونسنے کی کوشش کریں۔

—— کراچی کے فن کار سیرت و کردار کے اونچے اسلامی اصولوں کے تحفظ میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔

—— اُن کو اپنے مشاغل میں مگن رہنے اور پاکستان اور اس کے دارالسلطنت کے بہم پہنچائے ہوئے حقوق اور سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کا ویسا ہی حق حاصل ہے، جیسا جماعتِ اسلامی کے ارکان کو۔

—— اگر جماعت اسلامی کے ارکان فن کارانہ سرگرمیوں کو فروغ دینے میں ہماری مساعی کو پسند نہیں کرتے تو ہم مشورہ دیں گے کہ وہ اپنی پسند کی جنت کسی دوسری جگہ جا کر بنائیں۔

—— خاتمۂ کلام پر ہم اپنے محبوب وزیراعظم اور گورنر سندھ اور دوسرے زعماء کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے اپنا پُرنوازش اور پُرجوش تعاون ہمیں بہم پہنچایا، جو اگر حاصل نہ ہو تو پاکستان میں آرٹ اور کلچر کی ترقی کے لیے کوئی تحریک کامیاب ہو ہی نہیں سکتی۔

—— یہ ہماری دلی تمنا ہے کہ پاکستان بغیر مذہبی تعصب اور تنگ نظری کی خلل اندازی کے ترقی کی راہ پر بڑھتا چلا جائے۔

اس عبرتناک بیان کو پڑھیے اور غور سے پڑھیے، اور ہو سکے تو اس کے آئینے میں "اسلامیت"

کے اُن تصوّرات کی جھلک دیکھنے کی کوشش کیجیے جو اسلام کا نام لیتے ہوئے دلوں میں مخفی رکھا جاتا ہے۔

اس بیان میں دیکھنے کی سب سے اہم چیز وہ "شکریہ" ہے جو خاتمے پر ہمارے "اکابر" کو پیشکش کیا گیا ہے۔ یوں تو یہ شکریہ ہے، لیکن امیر جماعت اسلامی کراچی و سندھ کی طرف روئے سخن کر کے اسے پیش کرنے سے یہ جتانا مقصود ہے کہ جانتے ہو ہماری فن کارانہ سرگرمیوں کی پشت پناہی کرنے والے کون کون لوگ ہیں، ہماری سرپرستی کیسی کیسی قوتیں کر رہی ہیں —— وزرا اور گورنر!

یہی وہ احساس ہے جس نے صاحبِ بیان میں غیر معمولی درجے کی جسارت پیدا کر دی ہے۔ وہ اس بیان میں اسلام، دستورِ پاکستان، جمہور کے رجحانات وغیرہ سے بہت اونچا اٹھ کر بات کر رہا ہے۔ اس "احساسِ قوّت" سے لفظ لفظ کا پیالہ لبریز ہے۔ اسی کی وجہ سے سارا بیان ایک چیلنج کا مزاج رکھتا ہے۔ یعنی کہا یہ جا رہا ہے کہ جب ملک کے وزیر اور گورنر اس راستے پر فنونِ لطیفہ کا قافلہ جلوس لے کر چل کھڑے ہوئے ہیں تو پھر دینی رجحانات ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہیں اور دستوری رپورٹ کے بنیادی اصول ہمارے قدم کیونکر روک سکتے ہیں؟ —— سیّاں بھئے کوتوال، اب ڈر کاہے کا!

اس بیان کی گہرائی میں اسلامی قدروں کو پسند کرنے والوں کے لیے دھمکی بھی موجود ہے یعنی اثر یہ ڈالنا مطلوب ہے کہ اس کام کی پشت پر وزیر اعظم اور ایک صوبائی گورنر اور دوسرے اکابر ہیں جو حاکمانہ اختیارات رکھتے ہیں اور جو سیکورٹی ایکٹ اور سیفٹی ایکٹ سے مسلّح ہیں۔ یہ دھمکی آخر میں جاکر بالکل کھلا کھلا انداز اختیار کر گئی ہے، یعنی جس کسی کو فینسی ڈریس شو اور نقابی ناچ اور مینا بازار جیسے رنگین ہنگامے پسند نہ ہوں اس کے لیے پاکستان میں کوئی جگہ نہیں ہے[1]۔

یہ بیان آئینہ ہے اُس قلیل التعداد مگر طاقت پائے ہوئے فرنگیت مآب عنصر کے ذہن کا جو ایک ہی وقت میں اسلام کے نعرے بھی لگاتا ہے اور اسلام کو پامال بھی کرتا ہے۔ نام کتاب و سنت کا لیتا ہے

---

[1] اس سے پہلے ایک دھمکی سکھر میں گرلز ہائی سکول کی غیر اسلامی سرگرمیوں کے سلسلے میں وہی مظہر صاحب کے ایک بیان پر سندھ کے ایک وزیر صاحب کی طرف سے دی جا چکی ہے۔ انہوں نے تو یہاں تک فرما دیا تھا کہ جو ہماری ان سرگرمیوں میں آڑے آئے گا ہم اسے سختی سے دبا دیں گے۔ اسی کو کہتے ہیں الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے!

اور سرچشمۂ ہدایت پیرس کو مانتا ہے۔ مذہب کا فارم بھی بتاتا ہے اور مذہب کو تنگ نظری اور تعصب کا نام بھی دیتا ہے۔ پھر جب اُس کا یہ تضاد لوگوں میں اضطراب پیدا کرتا ہے تو یہ ان کو دھمکیاں دیتا ہے۔

ہم صاحبِ بیان اور اس کے فن پرست طبقے کا نفسیاتی تجزیہ کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔

(۱) پیرس آرٹ اور کلچر کے وسیع خزانوں سے مالا مال ہوگا، ہزار مرتبہ ہوگا، لیکن کیا وہ آرٹ اور کلچر اسلام کا ترجمان ہے؟ اس میں قرآن بولتا ہے؟ اس میں سنّت اپنا اظہار کرتی ہے؟ اس میں انبیا کی تعلیم گندھی ہوتی ہے؟ اُس میں وہ کونسا جزء ہے جس کی وجہ سے ہم اُس پر فریفتہ ہوں۔

(۲) کیا واقعہ یہ نہیں ہے کہ آرٹ اور کلچر کے اس قارون کو گذشتہ جنگِ عظیم میں بودا ثابت کرنے اور بالکل تیسرے درجے کی طاقت بنا دینے میں منجملہ دیگر اسباب کے خود اس آرٹ اور کلچر کا بھی بڑا حصّہ ہے؟

(۳) مسلم ہسٹری میں آرٹ اور کلچر کا ظہور واجد علی شاہ اور محمد شاہ رنگیلے کے دَور سے بہت پہلے ہوا سہی، لیکن کیا آپ اس کے سرچشمے محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا ابوبکر صدّیق، یا عمر فاروق، یا عثمان غنیؓ، یا علی مرتضیٰؓ، کے دَور میں دکھا سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو کیا ہر وہ چیز جو مسلمان بادشاہوں میں سے کسی کے دَور میں ہمارے ہاں نمودار ہوگئی ہو وہ از خود "اسلامی" ہو جائے گی؟ ہماری تاریخ میں سازشیں بھی ہوئیں، قتل بھی ہوئے، زہر خورانی بھی ہوئی، جبر و تشدد بھی ہوا، فحش بھی مچی، زنا بھی ہوئی، عیاشیاں بھی کی گئیں، غدّاری کے واقعات بھی ہیں، وعدہ خلافیاں اور دھوکے بھی کیے گئے ہیں، سلب و نہب بھی ہوا ہے، ائمۂ امّت کو ستایا بھی گیا ہے، تو کیا یہ سب کچھ "اسلامی" بھی ہو گیا۔ کسی چیز کے اسلامی ہونے کے لیے ضروری ہے کہ خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنّت اور پھر نیچے آکر کم سے کم سنّتِ خلفائے راشدین اسے جائز قرار دے۔ اور کوئی چیز یہاں حجّت نہیں ہے۔

(۴) مصر اور ترکیہ اور دوسرے مسلمان ممالک کا کسی چیز کو اختیار کر لینا اگر اسلامیت کی سند ہے تو پھر ماشاء اللہ ان مآخذ سے وہ ماڈرن اسلام ہاتھ آئے گا کہ رہے نام اللہ کا!

(۵) آپ کا یہ فرمانا کہ "اخلاق و کردار کی قدریں جو کسی قوم کو عظمت دیتی ہیں کسی ایک مذہب

کا اجارہ نہیں" ـــــــ اس حقیقت کے انکار پر مبنی ہے کہ "ان الدین عند اللہ الاسلام" (اللہ کے نزدیک تو دین (نظامِ حیات) بس اسلام ہی ہے) اور اس حقیقت کے بھی انکار پر مبنی ہے کہ پہلے اسلام کی امانت جن قوموں کی تحویل میں دی گئی تھی انہوں نے خیانت کرکے اسے مسخ کر ڈالا ہے اور اس کا ایک حصہ ضائع کر دیا ہے۔ پھر آپ کا یہ ارشاد کہ اسلام کے بغیر بھی مغربی قومیں عظمت یافتہ ہیں، اس امرِ واقعہ سے لاعلمی پر مبنی ہے کہ ان قوموں کو جہاں ایک طرف سے مادی ترقی حاصل ہے وہاں دوسری طرف اخلاقی مفاسد کا گھن بھی انہیں کھا رہا ہے۔

(٦) یہاں کسی کی طرف سے اپنے نظریات کو دوسروں پر لادنے کا سوال نہیں، یہاں تو صورتِ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کی اکثریت نے اپنی اجتماعی مرضی کا اظہار کرتے ہوئے دستوری رپورٹ کی قرارداد مقاصد اور اس کے رہنما اصولوں میں اُن اخلاقی نظریات و تصورات کو صراحت سے پیش کر دیا ہے جن پر وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کو ڈھالنا چاہتی ہے۔ اس نے اپنا سرچشمۂ ہدایت صرف خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو قرار دیا ہے ـــ مسلمان بادشاہوں کی تاریخ، مصر اور ترکی اور پیرس کے آرٹ کے خزانوں کو نہیں! ـــ اس نے ایک ایسی فضا بنانے کا فیصلہ کیا ہے جس کے اندر مسلمان اپنی زندگیاں اسلام پر استوار کر سکیں، اب اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ نہیں میں اس فیصلے کو نہیں مانتا اور میں تو ایسی فضا میں زندہ رہنا پسند نہیں کرتا تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے لیے کوئی دوسری بہتر جگہ تلاش کرے۔

(٧) یہاں اسلام اور اسلامی اخلاق اور اسلامی قدروں کے بارے میں ایک متفقہ اجتماعی تصور دستوری جامہ پہن رہا ہے، اور اس تصور کو حکومت کا ایک ایک شعبہ اور اکثریت کا ایک ایک فرد لے کے چلے گا اور اس کی پاسبانی کرے گا اور اسے نقصان پہنچانے والی ہر مفسد طاقت سے ماحول کو پاک کرنے میں حصہ لے گا۔ اب یہ قوم کی قوم اسلام کے معروف کو قائم کرنے اور اسلام کے بتائے ہوئے منکر کو محو کرنے میں ہمہ تن لگ جائے گی۔ اب یہاں مذہب و اخلاق نجی معاملہ نہیں، ایک اجتماعی مسئلہ ہوگا۔ اب کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ میرا اپنا ایک تصورِ مذہب و اخلاق ہے جس میں

کسی دوسرے کو مداخلت کا حق نہیں۔ ایک شخص اٹھے اور یہاں کاشی اور متھرا کی فضا بنانا چاہیے دوسرا یہاں پیرس کا ماحول تیار کرنے میں لگ جائے، تیسرا یہاں ننگا کلب قائم کرے، چوتھا غسل آفتابی کی تحریک شروع کر دے ـــ اب اس طرح کی آزادی نظریات و کردار کا یہاں کوئی کام نہیں ہے۔ یہاں جو بھی کوئی اقدام یا حرکت کرے گا اسے ثابت کرنا ہوگا کہ یہ اسلام کا تقاضا ہے اور عین کتاب وسنت کے مطابق ہے۔ ورنہ پوری قوم اس کی مزاحمت کرے گی، دستور اس کی مزاحمت کرے گا، حکومت اپنی ساری طاقتوں سے اس کی مزاحمت کرے گی۔

(۸) بہت دلچسپ ہے کراچی کے فن کاروں کا یہ ادّعا کہ وہ اسلام کے بلند اصولِ اخلاق کے تحفظ میں پیش پیش ہیں۔ جی ہاں! اسلام کے اصولِ اخلاق کا تحفظ فینسی ڈریس شو اور ثقافتی ناچ سے زیادہ اور کن سرگرمیوں کے ذریعے ہوتا ہوگا۔

(۹) "آزادی" اور "حقوق" کا یہ انوکھا تصور کہ اسٹیٹ جن اصول و مقاصد پر قائم ہو رہا ہے ان کی دھڑتے سے توہین و تخریب کی جائے اور مسلمان کہلا کر بلکہ اسلام پر کچھ نہ کچھ احسان دھر کر کی جائے، سے بر سرِ عام بیان کر کے تو آرٹ کا مثالی نمونہ پیش کیا گیا ہے یعنی آپ کا خیال یہ ہے کہ اسلام مسلمانوں کو خود اپنی بیخ کنی کی اجازت بھی دیتا ہے اور اسلامی ریاست خود اپنی تخریب کے حقوق بھی اپنے مسلم شہریوں کو دیتی ہے۔ آزادی سے مراد اگر اسلام سے آزادی ہے اور حقوق سے مراد اگر اسلامی ریاست کی جڑیں کھودنے کے حقوق ہیں تو ایسی آزادی اور ایسے حقوق کے لیے بس پیرس ہی کی فضا موزوں رہے گی، پاکستان میں آپ مشکل ہی حقوق حاصل کر سکیں گے۔

ہماری نوخیز اسلامی رائے عام آج جیسی کچھ بھی ہو، عنقریب یہ ایک طوفانی قوت ہو گی اور اسلام اور پاکستان کے ساتھ وہ اس طرح کا مذاق گوارا نہیں کرے گی۔

(۱۰) جب تک پاکستان کا دستوری مزاج سیکولر تھا تو بلاشبہ اس کی ترقی مذہبیت سے آزاد اور منحرف ہو کر آگے بڑھتے میں تھی اور اس میں ہر مذہبی مداخلت پر تعصب اور تنگ نظری کی پھبتی کسنے کا کھلا موقع تھا، لیکن اب صورت بالکل برعکس ہے، یعنی اب اسلام کی زیادہ سے زیادہ پابندی سے ترقی نمودار

ہوگی اور اس ترقی میں الحاد اور فسق کی مداخلت بے جا تعصب اور تنگ نظری کی تعریف میں آئے گی اور ایسی مداخلت کرنے والے عناصر سوسائٹی میں اچھوت بن کے رہ جائیں گے۔

(۱۱) آپ قوم کے اکابر کو غیر اسلامی ہنگامہ ہائے رنگین کی پشت پر دکھا کر زیادہ شادماں نہ ہوں کیونکہ اگر آپ جیسے لوگوں نے ان کو غلط فہمیوں میں ڈال ڈال کر اکثریت کے جذبات و احساسات سے لڑا دیا تو اس سے خود انہی کو نقصان پہنچے گا۔ یہاں اب پائداری، قوت، اعتماد اور عوامی تعاون وہی قیادت حاصل کر سکے گی جو اخلاص سے اسلامی نظام کو قائم کرنے میں سرگرم عمل ہو۔ جو قوت بھی کھو کھلے اسلامی نعروں کے ساتھ اسلام کو پامال کرے گی وہ پاکستان کی فضا میں کبھی قدم نہیں جما سکتی۔ پس براہ کرم اکابر کو غلط مشورے نہ دیجئے۔

اوپر ہم نے جن ناخوشگوار واقعات کا نوٹس لیا ہے، ہمارے لیے اُن کا تذکرہ کرنا بھی بڑا ناخوشگوار کام ہے۔ ہم اپنی زبان اور اپنے قلم کو، اور بالخصوص ترجمان القرآن جیسے جریدے کے صفحات کو اُن واقعات کے بیان میں استعمال کرنے پر اپنے آپ کو بڑی مشکل سے تیار کرتے ہیں۔ اپنے اکابرِ قوم جن کے بہر حال ہم کبھی بدخواہ نہ تھے ۔ کی کمزوریوں کا تذکرہ کرنا اور ان کا ناقدانہ تجزیہ کرنا کوئی دلچسپ مشغلہ نہیں ہے کہ اس سے مزہ لیا جا سکے۔ یہ ایک تکلیف دہ فرض ہے جسے چار و ناچار ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس تذکرے کا منشا صرف یہ ہے کہ ہم اپنے ملک کی مسلم لیگی قیادت پر یہ واضح کر دیں کہ آپ کی قوم نہ صرف یہ کہ ان چیزوں کو سخت ناپسند کرتی ہے، بلکہ "اسلامی دستور" کا جو عملی مفہوم وہ ان سرگرمیوں کے آئینے میں دیکھتی ہے اس کی وجہ سے اس میں ایک بددلی، بے اعتمادی، جمود اور بسا اوقات شدید اضطراب پیدا ہونے لگتا ہے۔ یوں جب عوام کا اطمینان درہم برہم ہو جاتا ہے تو ان کے اندر ہر مفسد عنصر کو قدم جمانے اور مختلف ناپسندیدہ رجحانات پھیلانے کا موقع ملتا ہے۔ قول اور فعل، نعروں اور اقدامات، دستوری فیصلوں اور عملی سرگرمیوں کا یہ خوفناک اور کھلا تضاد قیادت کے لیے کسی حال میں بھی مفید نہیں ہو سکتا۔ بس یہ حقیقت ہے جسے خیر خواہی اور اخلاص کے ساتھ ہم سامنے لانا چاہتے ہیں۔

اصول پسندی، معقولیت اور اخلاص کے راستے کے سوا کسی قیادت کے لیے پائداری، عوامی اعتماد اور قوم کے تعاون کے حصول کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ ہم اپنے اکابر کو اسی راستے پر چلنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس راستے پر چلنا ہو تو پھر اپنے حقیقی ایمان اور نظریے اور پسند کے خلاف کبھی کوئی ایسی بات نہ تسلیم کیجیے، نہ اپنے نعروں میں شامل کیجیے، نہ دستوری فیصلوں میں داخل کیجیے، نہ اپنی تقریروں کو مزین کرنے میں استعمال کیجیے جس پر عمل کرنے کا ارادہ نہ ہو۔ اکثریت اگر ایسی کسی بات کے لیے تقاضا اور اصرار کرے تو اسے سمجھائیے، اسے دلائل دیجیے، اسے اپنی رائے سے متاثر کیجیے، اس کے رجحانات کی غلطی (اگر ہو تو) اس پر واضح کیجیے، اس کا ضمیر بدلیے، اس کے سوچنے سمجھنے کے انداز میں تغیر پیدا کیجیے اور اس کا ذہنی تعاون اپنے ایمان اور نظریات، اپنے ترقی کے تصورات، اپنے آرٹ اور کلچر کے ذوق کے لیے حاصل کیجیے۔ پھر اگر لادین سیاسی نظام، فرنگی معاشرت، پیرس کے آرٹ اور کلچر، کراچی کے فنکاروں کے اصولِ اخلاق و سیرت اور فینسی ڈریس شو اور ثقافتی ناچ کے لیے رائے عام ہموار ہو جائے تو علی الاعلان اپنے نعروں اور تقریروں اور دستوری فیصلوں کے ذریعے اپنے عزائم کو لے کے اٹھیے۔ پورے زور سے انہیں قول میں بھی لائیے اور عمل سے بھی پیش کیجیے۔ بخلاف اس کے اگر اکثریت کی رائے کو آپ اپنے ایمان اور نظریات اور تصورات اور عزائم کے حق میں ہموار نہ کر سکیں تو اخلاص و دیانت کے مطابق جمہوری راہ یہ ہے کہ اقتدار کی کرسیاں خالی کر کے اکثریت کو آپ موقع دیں کہ وہ اپنے ایمان اور نظریات اور تصورات کے تحت زندگی کی تعمیرِ نو کے لیے جن معماروں کی خدمات حاصل کرنا چاہتی ہو کر لے۔

لیکن افسوس ہے کہ ہمارے اکابر یہی نہیں کرتے۔ اب دیکھیے کہ دستور میں اسلام کے تقاضوں کو رہنما اصول قرار دینے کے بعد جہاں ایک طرف فراری ذہنیت کے سارے مذکورۂ بالا کرشمے ہمارے سامنے پیش کیے جا رہے ہیں وہاں اسلام کو برابر تقریروں اور نعروں کے لیے سامانِ آرائش بھی بنایا جا رہا ہے۔ حال ہی میں کراچی میں سائنس کانفرنس کے دوران انعقاد میں تعلیم کے مسئلے پر بھی ایک مجلس مشاورت (SYMPOSIUM) منعقد ہوئی تھی۔ اس میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور ڈاکٹر محمود حسین سابق وزیر تعلیم نے جو اظہارِ خیال کیا ہے اور جس پر اتفاق رائے پایا گیا ہے اس میں حسب ذیل نکات بڑے

اہم ہیں :-

—— اسلام نجی مذہب نہیں بلکہ مکمل نظامِ زندگی ہے۔

—— اسلامی اصولوں پر اگر معاشرے کی تعمیر کی جائے اور جمہور کے اخلاق کو ان کی بنیاد پر اٹھایا جائے تو ایک ایک خرابی کا قلع قمع ہو سکتا ہے۔

—— اس مقصد کے لیے ناگزیر ہے کہ تعلیم جو اب تک بے مقصد چلی آرہی ہے، اسے اسلامی اصولوں پر استوار کر کے بامقصد بنایا جائے۔

—— ہمارے نظامِ تعلیم کا مزاج اسلامی ہونا چاہیے۔

دیکھیے کہ کتنی اچھی باتیں ہیں، کتنی سچی باتیں ہیں، یہ اکثریت کے رجحانات سے کتنی مطابقت رکھتی ہیں۔ لیکن اِن باتوں کا مفہوم جب لوگ عملی سرگرمیوں کے لغت میں دیکھتے ہیں تو بالکل برعکس ملتا ہے۔

پھر، ابھی گنتی کے چند روز بیتے ہیں کہ ہمارے وزیرِ اعظم نے مشرقی پاکستان کی ناسازگار انتخابی فضا کو دیکھ کر عوام کے جذبات کو اپیل کرنے کے لیے یہ نعرہ لگایا کہ "ہم سب ایک خدا، ایک قرآن اور ایک حدیث کو ماننے والے ہیں"۔ لہٰذا ہمیں باہم متحد اور ہم آہنگ رہنا چاہیے۔ کتنا صحیح نعرہ ہے، کتنی اچھی اسلامی اپیل ہے! لیکن یہ کما حقہٗ نتیجہ اس لیے نہیں دکھاتی کہ پاکستان کے عوام جس خدا اور جس قرآن و حدیث کو مانتے ہیں، اس کے دین میں اُن ہنگاموں کی کھپت نہیں ہے جن سے ابھی ابھی وزیرِ اعظم فارغ ہو کر انتخابی میدان میں پہنچے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ برسرِ اقتدار عنصر کا خدا اور اس کے قرآن و حدیث کوئی اور ہوں گے جو پیرس کو سرچشمۂ تہذیب قرار دیتے ہیں، جو مغربی عریانی و بے حیائی کو آرٹ اور کلچر کا نام دیتے ہیں، جو اخلاقی تصورات میں ہر ایک کو کھلی چھوٹ دیتے ہیں، جو دین کی پابندی و احترام کو جہالت، اندھی عقیدہ پرستی اور تنگ نظری کی تعریف سے پیش کرنے کا درس دیتے ہیں۔ بنائے اتحاد خدا اور قرآن اور حدیث کا لفظی نعرہ نہیں ہو سکتا، وہ عملی یک جہتی، فکری ہم آہنگی اور اخلاقی یکسانی ہو سکتی ہے جو خدا اور قرآن اور حدیث کی تعلیم سے عالمِ واقعہ میں رونما ہو۔ وہ کہاں ہے؟

آخر محض بے معنی لفظوں کے کھوٹے سکے کب تک چلائے جا سکتے ہیں!

اصول پسندی، معقولیت اور اخلاص کا تقاضا دوسرے پہلو سے یہ ہے کہ جس چیز کو آپ زبان سے تسلیم کریں، جسے اپنے عزائم کا جزء بنا لیں، جسے دستوری فیصلے کی حیثیت دے دیں، پھر اس کے مطابق اپنے ایمان و نظریہ میں بھی حقیقی تبدیلی پیدا کریں اور اپنے عمل و کردار سے بھی اسی کو فروغ دینے کی جدوجہد کا مظاہرہ کریں۔

یقین جانئے کہ اگر آپ اپنے اسلامی نعروں اور تقریروں اور دستوری فیصلوں کے مطابق ذہن و عمل کی تبدیلی کا مظاہرہ کریں تو پوری کی پوری قوم آپ کے ساتھ تعاون ہی نہیں کرے گی، آپ پر فریفتہ ہو گی، آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائے گی اور ایک ایسی مقبولیتِ عام کے دروازے آپ کے لیے کھل جائیں گے کہ جس کا اب تک آپ حضرات تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ مقبولیت پا کر اگر آپ اس قوم سے کوئی اپیل کریں گے تو بچہ بچہ اس پر لبیک کہے گا، پھر اگر آپ اتحاد کے لیے پکاریں گے تو کوئی ایک فرد بھی اختلاف نہیں کرے گا، آپ کسی فنڈ کا مطالبہ کریں گے تو لوگ اپنے اوپر فاقے گوارا کر کے بھی آپ کی جھولیاں بھر دیں گے، آپ دفاع کے لیے بلائیں گے تو ساری قوم سروں پر کفن باندھے نکل کھڑی ہو گی، آپ مناصب سے بھاگنا بھی چاہیں گے تو لوگ زبردستی یہ بوجھ آپ ہی کے کندھوں پر رکھیں گے۔ ہر طرف ایک نیا جذبہ امڈ پڑے گا، ترقی کی رَو دوڑنے لگے گی، قومی عظمت کے نئے سرچشمے اُبلتے دکھائی دیں گے اتحاد اور ڈسپلن کا ایک نیا معیار قائم ہونے لگے گا، مفسد عناصر کے لیے اپنی سرگرمیاں جاری رکھنا سرے سے ممکن نہ رہے گا، اور لوگوں کو قابو میں رکھنے کے لیے کسی استبدادی قانون کے استعمال کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔

اس مقبولیت کو حاصل کرنے کا ایک زرّیں موقع پہلے بھی آیا تھا۔ قراردادِ مقاصد کے پاس ہونے کے بعد ساری قوم میدانِ عمل میں قیادت کی طرف سے ایک نئی تبدیلی پیدا کر دکھانے کی امیدیں لگائے بیٹھی تھی لیکن ایک بھاری کریڈٹ حاصل کرنے کا وہ زرّیں لمحہ اس الٹی روش نے غارت کر دیا جس کے خلاف قراردادِ مقاصد کا ایک ایک لفظ کرب سے چیخ اٹھا۔ اب یہ موقع پھر آیا ہے۔ دستوری رپورٹ کے رہنما اصولوں کو (تشریحیہ چور دروازے بند کر دیے جائیں) پاس کر کے اگر ہماری قیادت فکر و نظر، اور عمل و کردار کی حقیقی تبدیلی کا ثبوت دے اور اسلامی معاشرہ کی بنیادیں رکھنے میں صحیح صحیح حصہ ادا کرے تو اس قوم کا صدقِ اعتماد، اس کا

مکمل تعاون اور اس کی پوری کی پوری اطاعت انہیں حاصل ہو سکتی ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ کاروانِ عمل ایک بار پھر دستوری فیصلوں کے خلاف چل پڑا ہے۔ قوم کی تمناؤں اور امنگوں کے خلاف دوبارہ اِس تضاد کا زور شور سے سامنے آنا لازماً بد دلی، بے اعتمادی اور اضطراب کو بڑھائے گا۔ پھر آپ اس اضطراب کو دبانے کے لیے تشدّد کے طریقے اختیار کریں گے۔ جب تشدّد کی دوا سے مرض بڑھتا نظر آئے گا تو خدانخواستہ آپ ان چھوٹے ہتھیاروں پر اُتر آئیں گے جن پر وہ طاقت نرچ ہو کر اتر آتی ہے جس کی کمر میں اقتدار کی تلوار بندھی ہو۔ پھر رائے عام کا قتلِ عام ہوگا اور اس کی نمائندگی کرنے والے بے گناہوں کے خون سے آپ ہاتھ رنگیں گے۔ مگر کوئی تخت جو لاشوں کے ڈھیروں اور خون کی لہروں پر بچھایا جائے، اپنے پایوں کو مضبوط نہیں بنا سکتا۔

مغربی تصورات کو مسلمان قومیں ——— ان میں سے خاص طور پر پاکستانی قوم ——— اپنے اندر جذب کرنے پر کسی طرح تیار نہیں ہیں۔ ان قوموں کی اکثریت پر اگر مغرب پرست اقلیت محض اختیارات کے زور سے مغربی تصورات کو ٹھونستی بھی ہے تو یہ اپنی جڑیں نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ تصورات چونکہ جہاں جس حد تک دخل پاتے ہیں اسلامی تصورات سے لازماً متصادم ہوتے ہیں، اس لیے مسلم قوموں میں ان کے خلاف شدید ردِعمل پیدا ہوتا ہے۔ ترکیہ میں کمالی تحریک نے حکومت کی طاقت سے سالہا سال تک اسلامی تصورات کی بیخ کنی اور مغربی تصورات کی آبیاری کی جو کوششیں کی ہیں اُن کے بعد بھی دیکھیے تو معاملہ وہیں کا وہیں ہے۔ بلکہ نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ مصطفیٰ کمال کی سیاسی عزت کو بچانے کے لیے قانون کے ڈنڈے سے کام لیا جا رہا ہے۔ یہی حال مصر کا ہے کہ عوام اسلامی تصورات سے ہزار تشدّد کا سامنا کرنے کے باوجود وابستہ ہیں۔ پاکستان کے عوام تو دینی احساس و شعور کے لحاظ سے اور زیادہ ہیں۔ یہاں مغربی تصورات کو بالجبر ٹھونسنے سے ذہنی کشمکش و اضطراب کی ایک ایسی صورت نمودار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی جو قومی تعمیر و ترقی کے لیے سخت موجبِ نقصان ہوگی۔ اور آج بھی پاکستان کی ترقی میں اگر کوئی چیز مانع ہے تو وہ یہی ہے کہ قوم کی اکثریت کسی اور طرف بڑھنا چاہتی ہے اور برسرِ اقتدار طبقے کی اقلیت اسے

کسی اور طرف گھسیٹتی ہے۔

بس ہمارا مشورہ یہی ہے کہ جو دستوری فیصلے اسلام کے مطابق ہوئے ہیں ان کے خلاف فراری ذہنیت کے ساتھ ایسی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی ہمارے ملک کے اکابر نہ کریں، جو وعدے قوم سے وہ کرتے رہے ہیں، اُن سے عمل کے میدان میں انحراف نہ کریں، جو اسلامی نعرے اور تقریریں وہ پیش کرتے ہیں اُن سے برعکس عملی مفہوم پیدا نہ کریں، کتاب و سنت کے اسلام کو قائم کرنے کا عزم ظاہر کرنے کے بعد وہ "ماڈرن اسلام" کے کرشمے نہ دکھائیں۔

قیادت کی مضبوطی، قوت اور مقبولیت کے لیے، ملک و قوم کی تعمیر و ترقی کے لیے اور اسلام کو ایک ریاست کی شکل میں استوار کرنے کے لیے ایک یہی سیدھا راستہ ہے۔

اسلامی ریاست کی نیو ڈال دینے کے بعد ہمارے ملک کی سب سے زیادہ قیمتی متاع ہماری وہ آئیڈیالوجی ہو گئی ہے جس کا ظہور دستوری رپورٹ کے رہنما اصولوں اور اس کی قرارداد مقاصد سے ہوتا ہے۔ اب ہماری آزادی اور ہماری قوت اور ہماری ترقی کا دارومدار اسی قیمتی متاع کے تحفظ پر ہے۔ اب ہمارے لیے یہی اصل سرچشمۂ حیات ہے اور اسی سے ہمارے تمام عزائم اور حوصلوں اور امنگوں کی آبیاری ہوتی ہے۔ یہ آئیڈیالوجی سلامت رہے تو ہم سلامت رہیں گے، یہ اغیار کی مداخلت سے آزاد رہے تو ہم آزاد رہیں گے، یہ نشوونما پائے تو ہم نشوونما پائیں گے، یہ مضبوط ہو تو ہم مضبوط ہوں گے۔ دوسری طرف اسے کوئی وجہ کمزور کرے تو ہم کمزور ہو جائیں گے، اسے کوئی سازش ملیامیٹ کرے تو ہم ملیامیٹ ہو جائیں گے اور اسے کوئی پھلنے پھولنے کی آزادی سے محروم کرے تو ہم بھی ترقی کرنے کی آزادی سے محروم ہو جائیں گے۔

اس آئیڈیالوجی کے سرچشمۂ حیات کا تحفظ اور نشوونما ارتقا ممکن ہے تو صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ دنیا کی کسی امپیریلیسٹ طاقت کو سیاسی، معاشی اور نظریاتی میدان میں ہمارے اوپر اثر انداز ہونے کا موقع نہ ملے۔ ہماری آئیڈیالوجی سے اختلاف رکھنے والی اور کوئی برعکس قسم کی آئیڈیالوجی رکھنے والی قوم

اپنا پرتو اس کے اوپر نہ ڈال سکے۔ لیکن اگر کسی کو ہم اس کا موقع دے دیں تو یہ سرچشمۂ حیات زہرآلود ہو جائے گا، یہ اپنی زندگی بخش برکات سے خالی ہو جائے گا اور ہم حقیقی آزادی، ترقی اور خوشحالی سے کبھی ہمکنار نہ ہو سکیں گے جو اسلامی اصولوں کے نتیجے میں ہمیں ملنی چاہیے۔

اسلامی ریاست اپنی برکات کے ساتھ اسی صورت میں پروان چڑھ سکتی ہے جبکہ وہ اپنی داخلہ و خارجہ پالیسی کو نئی اٹھان اٹھانے کے لیے ہر قسم کی مداخلتوں سے آزاد ہو۔ وہ اپنے سیاسی و معاشی مسائل کو خود حل کر سکے، وہ اپنے بھلے اور بُرے کا خود فیصلہ کر سکے، وہ اپنے باشندوں کے لیے خیر و شر کو خود متعین کر سکے، وہ صلح و جنگ کے بین الاقوامی معاملات کو اپنی مرضی سے طے کر سکے۔ لیکن اگر اسے پیدا ہوتے ہی کسی ایسے معاہدے یا بین الاقوامی معاملے میں جکڑ دیا جائے کہ اس کی آزادانہ نشوونما میں رکاوٹیں حائل ہو جائیں تو کاغذ پر لکھا ہوا اسلامی دستور کوئی کرامت نہیں دکھا سکتا۔ اس دستور اور اس کے مقاصد کے تحفظ کا اگر اوّل روز ہی سے اہتمام نہ کیا جائے تو حالات اس کو روندتے ہوئے آگے بڑھ جائیں گے۔

آج اگر ہم کسی فائدے کے لالچ اور کسی امداد کی احتیاج کے تحت لاپروائی سے ایسے معاملات کر رہے ہیں جو کل جب اپنے پورے برگ و بار لائیں گے تو ہمیں بعد از وقت یہ محسوس ہو گا کہ:-

—— ہم مستقبل کی جنگ کے ایک فریق کے ساتھی بن گئے ہیں جس میں ہماری آئیڈیالوجی اور ہماری مصلحت ہماری شرکت کے حق میں نہیں جا رہی ہے، اور عین وقت پر اندازہ ہو کہ تیر کمان سے نکل چکا۔

—— ہماری منڈیوں پر، بلکہ ہمارے پیدا آوری نظام پر وہ طاقت اثرانداز ہونے لگی ہے جس کے کسی احسان اور جس کی کسی امداد کے ہم منّت کش ہوئے تھے۔

—— ہمارے کلچر اور ہماری معاشرت کو خود ہمارے نمائندوں کے ہاتھوں اور خود ہمارے قومی اداروں کے ذریعے ہمارا کوئی "محسن" ملک ملیامیٹ کر رہا ہے اور ایک نامطلوب کلچر اور معاشرت کو ہمارے اوپر مسلط کر رہا ہے۔

—— ہمارے داخلی سیاسی عناصر اور رجحانات میں سے کسی کو ابھارنے اور کسی کو دبانے کے لیے ملک کی رائے عام اور قانون اور مفادِ ملکی کے بجائے پس پردہ کسی اور کی رضا فیصلہ کن بن گئی ہے۔

آخر امپیریلیسٹ طاقتوں کے طریقِ کار کی ایک مستقل تاریخ ہے اور ان کی کرم فرمائیوں اور عنایات اور ان کے احسانات کے پیچھے کام کرنے والے منصوبوں نے دیس دیس میں جو گل کھلائے ہیں ان کے رنگ و بُو سے ایک دنیا واقف ہے۔ "عنایات" ہوتی ہیں مگر کہیں بھی "فی سبیل اللہ" نہیں ہوتیں، ہر عنایت سوداگرانہ ذہن کے ساتھ کی جاتی ہے۔ ایک ہاتھ سے جو کچھ دیا جاتا ہے، دوسرے ہاتھ سے اس سے زیادہ لیا جاتا ہے۔ آخر جو ملک آپ کو غلہ یا روپیہ یا اسلحہ دیتا ہے تو وہ جواب میں آپ سے کچھ لیگا بھی! سوال یہ ہے کہ اس کی نظر کس مفاد پر ہے؟

آپ کہتے ہیں کہ ہم لینے کو تو سب کچھ لے لیں گے، دیں گے کچھ نہیں! فی الواقع اگر ایسی گانٹھ کی پوری اور عقل کی کوری کوئی قوم آپ کے علم میں آگئی ہو تو یہ دریافت بڑی یادگار زمانہ ہوگی — ورنہ اندیشہ جس دوسری صورت کا ہے وہ یہ ہے کہ جو کے پکھیرو کو دانۂ صیاد نظر آجاتا ہے لیکن دامِ ہمرنگِ زمیں نظر نہیں آیا کرتا۔ آپ اگر دانہ بھی کھالیں اور دام سے بھی بچ نکلیں تو تاریخِ انسانی میں یہ پہلا معجزہ ہوگا۔

امپیریلیسٹ قوتیں جن ممالک میں بھی اپنا میدانِ تگ و تاز بناتی ہیں وہاں کسی ایسے اصول، نظریئے تحریک اور سیاسی نظام کے لیے پنپنے کی فضا نہیں بننے دیتیں جو ان کے مفاد میں حائل ہو سکے۔ وہ کسی زیرِ اثر آئے ہوئے معاشرہ کو کبھی ایسی بنیادوں پر تعمیر ہونے نہیں دیتیں جو ان کے مقاصد کے لیے سازگار نہ ہوں۔ ایسی طاقتوں سے جتنا خطرہ کسی قوم کی سیاسی اور معاشی آزادی کو ہو سکتا ہے اس سے زیادہ شدید خطرہ اس کی آئیڈیالوجی کی آزادی کو ہوتا ہے۔

پس ہمہ گیر تبدیلی کا منصوبہ پیش کرنے والا اصولی دستور بنا کر نئی زندگی کا آغاز کرتے ہوئے ایک قوم کو غیر ملکی طاقتوں سے معاملات اور معاہدات کرتے ہوئے انتہائی محتاط ہونا چاہیے۔ لیکن ہمارے سربراہ کار ایک طرف اسلامی دستور بناتے ہیں اور دوسری طرف بین الاقوامی معاملات طے کرنے میں نہ صرف لاپرواہی سے کام لیتے ہیں، بلکہ ان کے قول و فعل کے تضاد کی وجہ سے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اس دستور کی روح اور اس کے مقاصد کی تباہی کے امکانات سے واقف ہوتے ہوئے وہ دانستہ اس طرح کے فیصلے نہ کر رہے ہوں۔ دونوں میں سے جو بھی صورت ہو، افسوسناک ہے۔

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

(بقیہ اشارات)

موجودہ دور کی ناسازگار ملحدانہ و مادہ پرستانہ فضا میں جو لوگ "اسلامی دستور" کے حامی ہیں، اُن کو ثبوت دینا چاہیے اس بات کا کہ وہ اس کی رکھوالی کے لیے مستعد بھی ہیں۔ لیکن اس کے برعکس اگر ان کی روش یہ ہو کہ ایک طرف وہ اس پودے کو ڈھول ڈھمکے کے ساتھ نصب کریں، اور دوسری طرف بادِ سموم کے جھونکوں کو بلا کے اس پر کرم فرمائی کرنے کا موقع بھی دیں تو اس تضاد کی قلعی بہت جلد کھُل کے رہے گی۔

جیسا انقلابی دستور ہمارے ملک میں بن رہا ہے اُس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ جو حکمراں طاقت اس کی تدوین کا سہرا اپنے سر باندھ رہی ہے۔ اس کے زاویۂ نظر کے "قطب نما" کی سوئی کے مثبت اور منفی دونوں سرے اپنا رُخ بدل کر ٹھیک اپنی جگہ پر آجائیں۔ اس کی محبت اور نفرت، اس کی پسند اور ناپسند، اس کی یگانگت اور غیریت کا معیار اس کے دستوری فیصلوں کے مطابق بدلنا چاہیے۔ اسلامی دستور بنا کر کام کرنا ہو تو ناگزیر ہے کہ غیر اسلامی عناصر سے آپ کی دُوری بڑھے اور ملک کے تمام اسلامی عناصر کا تعاون حاصل کرنے کے آپ درپے ہوں۔ لیکن اگر عملی پالیسی اس کے برعکس جا رہی ہو تو عوام آپ کی نیتوں پر شبہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

بدقسمتی سے پہلے بھی یہاں صورتِ واقعہ یہ پیش آئی تھی کہ قرار دادِ مقاصد جب پاس کی گئی تو عین اس لمحے اسلامی دستور کے عوامی مطالبہ کو لے کر اٹھنے والی اصل طاقت زیرِ عتاب تھی، اس گناہ کے تین مجرم جیل میں تھے اور قرار دادِ مقاصد پاس کرتے ہی جو پہلا کارنامہ سرانجام دیا گیا وہ یہ تھا کہ ان کی میعادِ نظر بندی میں مزید چھ ماہ کا اضافہ کیا گیا۔ ٹھیک وہی صورت اب بھی پیش آئی ہے کہ جب دستوری رپورٹ زیرِ بحث آئی تو اس وقت جماعت اسلامی کے رہنما اور اس کے نمایاں کارکن ابتلا سے گذر رہے تھے۔ مولانا مودودی کو پھانسی کی کوٹھڑی سے گذار کر ۱۴ سال قید بامشقت میں ڈالا جا چکا تھا۔ اوپر سے انڈمنٹی ایکٹ کے ذریعے عدالتی اپیل کے دروازے بند کر دیے گئے۔ اور اب جمہوریۂ اسلامیہ پاکستان کو نئی اسلامی بنیادوں پر استوار کرنے کا فیصلہ کر چکنے کے بعد بھی مولانا مودودی اور ان کے ہم جُرم

رفقاء کو عوامی مطالبہ کے علی الرغم حکومت رہا کرنے پر تیار نہیں ہو رہی۔ ایک طرف اسلامی معاشرہ کی تعمیر کے فیصلے کرنا اور دوسری طرف ٹھیک اُس طاقت کو دبانے کی مساعی کرنا جو اس کام کی پوری پوری صلاحیتیں رکھتی ہے، بڑے ناقابلِ اعتماد ذہنی تضاد کی دلیل ہے۔

فراریت کے ان سارے مظاہر کو ہم جذبۂ خیر خواہی کے ساتھ سامنے لا کر مسلم لیگی قیادت کو مشورہ دیتے ہیں کہ سنبھلنے کے آخری موقع سے فائدہ اٹھائے، ورنہ عوام میں اس کے وقار کا خاتمہ پوری تیز رفتاری سے ہوتے ہوتے جس آخری حد پر آچکا ہے اُس کا اندازہ اگر مغربی پاکستان کے حالات سے نہ ہو سکتا ہو تو مشرقی پاکستان کے حالات سے بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ قیادت کوئی بھی ہو، اگر قائم رہ سکتی ہے تو قوم کی اجتماعی تمناؤں اور امنگوں کو پورا کر کے، اور عام لوگوں کا اعتماد اور اطمینان حاصل کر کے ہی رہ سکتی ہے۔ عام لوگوں کو اضطراب میں ڈال کر اور ان کے اجتماعی رجحانات کو پامال کر کے کسی بھی اقتدار نے پائداری کبھی حاصل نہیں کی ہے۔ اور کسی قیادت کی ساکھ، نعروں اور تقریروں اور لفظی فیصلوں سے نہیں جمتی، اس کی عملی روش سے جمتی ہے۔ سیاست کی دنیا میں نعروں اور تقریروں اور فیصلوں کی ہنڈیاں چلتی ضرور ہیں، مگر لوگ ان کو عملی کارناموں کی مارکیٹ میں جب بھنانے کیلئے لاتے ہیں تو ان کو مایوس لوٹانے والے صرافوں اور بینکروں کی ساکھ آناً فاناً ختم ہو جاتی ہے اور پھر یہ سیاسی ہنڈیاں سونے کے حروف میں بھی لکھ کر پیش کی جائیں تو ان کو ردی کے پرزے سے زیادہ کبھی وقعت نہیں دی جاتی۔ اور پبلک آپ کے "اسلامی دستور" کی گراں بہا ہنڈی کو آپ کے عملی کارناموں کے صرافہ میں بھنانے کے لیے منتظر کھڑی ہے۔